رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

(۳)

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ بی۔ اے

آدم کا گناہ | اس باب میں میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں اور صاحب تعلیمات میں یونہی نقطی سی نزاع باقی رہ گئی ہے یعنی وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت آدم اپنے گناہ کی پاداش میں جنت سے نکالے گئے، لہذا جس گناہ کی سزا مل جائے اس کی معافی کیا ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ جنت سے تو وہ ضرور نکالے گئے لیکن یہ اس گناہ کی پاداش میں نہ تھا، بلکہ گناہ کے طبعی اثر کی بنا پر تھا۔

آپ پہلے توبہ اور عفو کے الفاظ کو لیجیے۔ توبہ کے لغوی معنی رجوع کے ہیں۔ یعنی جدھر سے منہ موڑ لیا تھا اس کی طرف پھر رُخ کیا جائے۔ اور جب اسکی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور صلہ علی آتا ہے تو اس کے معنی توبہ قبول کرنے، یعنی اپنے فضل و احسان کے ساتھ پھر اس بندے کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ گویا جس کی توبہ قبول ہوئی، وہ راندۂ درگاہ نہ ہوا، بلکہ اس کی رحمتوں نے پھر اسکی طرف رجوع کر لیا۔ اور عفو کے معنی ہیں القصد لتناول الشئ (مفردات راغب) اور قرآن کریم میں جہاں بھی عفو استعمال ہوا ہے اس کے معنی ایسی معافی کے ہیں جس کے بعد کچھ باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ آیت (۲۳۷) میں دیکھیے ایسی عورتیں جنھیں بلا تمسک طلاق دیدی جائے انکا نصف مہر واجب آتا ہے۔ مگر۔

إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ — یہ کہ وہ خود معاف کر دیں یا وہ معاف کر دے

عقدۃ النکاح (۲ : ۳۱) جس کے ہاتھ میں عقدہ نکاح ہو۔

اس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں اسی بنا پر گناہ کے اثر کے ازالہ کو عفو گناہ کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے

کہ ان دونوں کے معانی مختلف ہیں اور جو آیت آپ نے پیش کی ہے وہی اس پر دلالت کر رہی ہے آپ نے فرمایا کہ

فتاب علیکم وعفا عنکم، میں عفا عنکم، تاب علیکم کی تفسیر کر رہا ہے۔ اس سے خود ثبوت ملتا ہے کہ توبہ اور عفو دو

الگ الگ چیزیں ہیں۔ اب اسی اصول پر حضرت آدم کے متعلق جو وارد ہوا ہے فتاب علیہ وھدیٰ تو اس

میں توبہ کی تفسیر ہدیٰ کیوں نہ قرار دی جائے۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی یعنی ہدایت فرمائی یعنی اللہ نے

ان کے گناہ پر شیطان کی طرح انہیں ملعون نہیں کیا بلکہ ان کو پھر شرف و اجتبا عطا فرمایا یا ان کو استغفار کی توفیق

دی۔ ان کی طرف رجوع فرمایا اور جنت میں آنے کا راستہ بتایا (وھدیٰ کہ ایمان وعمل صالح کی راہ سے جنت میں

آجاؤ۔ اور یہی کچھ تعلیمات قرآن میں ہے۔ قبول توبہ کی ایسی صورت جس میں جرم سزا سے نہ بچے، صاحب تعلیمات کے

نزدیک معافی نہیں، خواہ وہ طبعی اثر سے ہو یا کسی اور اثر سے۔

اب قرآن کریم میں دیکھیے تو کچھ ایسی ہی نہج کے اشارے ملتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں قصہ آدم میں یوں مذکور ہے

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔

شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی وجہ سے لغزش دیدی سو ان کو اس میں سے نکال کر رہا جس میں وہ دونوں تھے۔ اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو۔ تم میں سے بعض بعضوں کے دشمن رہیں گے۔ اور تمکو زمین میں چند ے ٹھیرنا

اور فائدہ حاصل کرنا ہے۔ ایک میعاد معین تک۔

یہاں ہبوط آدم کا حکم موجود ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمہیں دنیا میں ٹھیرنا اور کام چلانا ہے لیکن

اس سے زیادہ کوئی ہدایت وارشاد نہیں، کہ اس وقت تک رحمت الٰہی نے رجوع نہیں کیا۔ اس سے آگے دیکھیے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ۔ ازاں بعد آدم نے اپنے رب سے چند الفاظ حاصل کیے تو

إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

اللہ نے انکی طرف توجہ فرمائی۔ بیشک وہی بڑا توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے ہم نے کہا کہ اترو اس سے سب کے سب پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت آئے، سو جو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کریگا تو نہ ایسے لوگوں کو کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ہی ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

یہاں آدم نے توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی۔ اور ان سے ہدایت کا وعدہ کیا جو تو سے پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ یہ وہی تفصیل ہے جو فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ میں مجمل تھی۔ ان کی توبہ قبول کی یعنی ہدایت عطا کی

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے توبہ قبول کرنے (یعنی بندے کی طرف رجوع کرنے) کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ توبہ قبول کرنے کے بعد وہ راستہ بتا دیا جس پر عمل پیرا ہونے سے گناہ کے اثرات زائل ہو جائیں جیسا کہ حضرت آدم کے لیئے فتاب علیہ وہدیٰ میں ہے۔ دوسرے یہ کہ توبہ قبول کی اور گناہوں کے اثرات میں سے کچھ بھی باقی نہ رکھا سب محو کر دیے جیسا تاب علیکم وعفا عنکم میں ہے۔ یہی سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں ہے

هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ (۴۲: ۳)۔

اللہ وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ سزا مل جانے کے بعد شرفِ اجتباء باقی نہیں رہتا[1]۔ تو کیا وہ لوگ جن سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جس کی فوری پاداش اسی دنیا میں مل جاتی ہو، اگر اس پاداش کے بعد توبہ کر لیں، اور ان کی توبہ قبول ہو جائے، تو آپ کے نزدیک کیا وہ ہمیشہ کے لیے شرفِ اجتباء سے محروم کر دیے جائیں گے؟ توبہ قبول ہونے کے معنی ہی یہی ہیں کہ شرفِ اجتباء، اور توجہاتِ رحمانی سے محروم نہ رکھے جائیں، لہٰذا اگر حضرت آدم کی توبہ بعد پاداش بھی تسلیم کر لی جائے تو یہ خدشہ باقی نہیں رہتا۔

[1] میں نے یہ کہیں نہیں کہا۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ گناہ کو معاف نہ کرنا اور اس پر سزا دینا، پھر اسی سزا کی حالت میں شرفِ اجتباء عطا کرنا، یہ دو بالکل متضاد باتیں ہیں۔ مدیر ترجمان القرآن

اس کے بعد آپنے سزا و گناہ کے فلسفہ پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ موضوع بڑا اہم اور مستقل ہے اور افسوس ہے کہ ضمناً میں بھی اس پر شرح و بسط سے کچھ نہیں لکھ سکتا لیکن آپنے جو طبیعی اور غیر طبیعی اثرات میں فرق کیا ہے میں اسے نہیں سمجھ سکا۔

آپنے فرمایا ہے کہ ہبوط کا حکم "سزا اور انتقام کے طور پر نہ تھا، بلکہ اس شجر کا مزہ چکھنے کا طبیعی نتیجہ تھا"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ گناہوں کی "انتقامی" سزا کے قائل ہیں لیکن میں تو قرآن کریم سے کوئی اشارہ نہیں پاتا جس میں یہ ہو کہ گناہوں کی سزا بطور انتقام دیجائے گی۔ انسان اگر گناہ کرتا ہے تو اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ لہٰذا انتقام کیسا؟ اللہ تعالیٰ کا انتقام اس مفہوم میں کبھی نہیں ہوتا جیسا آپنے فرمایا ہے۔

پھر آپنے فرمایا کہ یہ ہبوط اس شجر کا مزہ چکھنے کا طبیعی نتیجہ تھا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں سزا غیر طبیعی بھی ہوتی ہے؟ خیال فرمائیے کہ اگر حضرت آدمؑ کے گناہ کا طبیعی اثر بعد عفو گناہ بھی اس امر سے مانع تھا کہ وہ جنت میں رہ سکیں، تو دنیا میں اگر ایک شخص ایک گناہ کے بعد تائب ہو جائے۔ اور اسے اس گناہ سے معافی بھی مل جائے۔ تو آپکے خیال کے مطابق اس گناہ کا طبیعی اثر تو باقی رہے گا جو ہو سکتا ہے کہ اسے جنت میں داخل ہونے سے روک دے۔ اور اگر کہا جائے کہ جنت میں داخلے کے وقت ایسے طبیعی اثرات (مثل احساس زوجی وغیرہ) مٹا دیے جائیں گے، تو جب حضرت آدم کا گناہ معاف کیا گیا تھا تو اس گناہ کے طبیعی اثرات مٹا دینا کونسا مشکل کام تھا حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا نظام جسمانی پر طبیعی اثر (جیسا آپنے شراب کے نشہ والی مثال میں بیان فرمایا ہے) تو فی نفسہ کوئی شے نہیں۔ ایک چور کا ہاتھ شرعی عدالت کے حکم سے کاٹ دیا جائے اور ایک مرد مجاہد کا بازو میدان جنگ میں شہید ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نظام جسمانی پر طبیعی اثرات یکساں ہیں حقیقت میں کس قدر فرق ہے۔ خدا کے حضور تو اس قسم کے طبیعی اثرات کا کچھ وزن نہیں۔ اور جب گناہ معاف کر دیا جاتا ہے تو ایسے اثرات جنکی فی الواقع کوئی حقیقت ہوتی ہے

مٹا دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (۴۲ : ۴)

جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے اور اکثر قصوروں کو اللہ معاف کر دیتا ہے۔

یعنے جو گناہ معاف نہیں کیے جاتے اور اُن کی سزا دنیا میں ملجانی ہوتی ہے، ان کی وجہ سے انسان مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جن گناہوں کی معافی مل جاتی ہے ان کے نتائج بھی انسان کے سامنے نہیں آتے۔ ظاہر ہے کہ اگر معافی میں محض خدا کی ناراضگی کی معافی ہی ہوتی تو مصائب جو لامحالہ کسی طبیعی شکل ہی میں آتے ہیں کس طرح سے ٹل جاتے؟ لہٰذا معافی میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اعمال کے ایسے طبیعی اثرات جن کا خدا کے نزدیک کچھ وزن ہو دونوں زائل ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات سے تو صاحب تعلیمات کا خیال ہی مرجح نظر آتا ہے۔

غلامی بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اسیران جنگ کو یا تو احسانًا رہا کر دیا جائے، یا فدیہ (بشکل زر نقد یا مبادلہ اسیران جنگ) لیکر۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ احسانًا چھوڑنا خلاف مصلحت ہو اور فدیہ ادا کرنے پر دشمن تیار نہ ہوں، تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ صاحب تعلیمات نے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں وہ شاہی قیدی ہوں گے۔ اور ان سے ایسا ہی سلوک کیا جائے گا لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ ایسی شکل میں وہ غلام بنا لیے جائیں گے۔ صاحب تعلیمات نے آپ کے اس دعوے کی دلیل میں قرآن کریم سے ثبوت مانگا تھا۔ سو آپ نے اپنے جواب میں اس طرف توجہ منعطف نہیں فرمائی۔ اور قرآن کریم سے اسیران جنگ کو غلام بنانے کے جواز میں ثبوت پیش نہیں کیا۔ البتہ دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ اول تو یہ کہ جب دشمن مسلمان اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھیں تو مسلمان ان کے قیدیوں کو کیوں نہ غلام بنائیں۔ بات تو ہے یہ جی لگتی ہوئی لیکن اس کا کیا علاج کہ قرآن کریم مسلمانوں کو اس سطح سے بہت بلند لے جانا چاہتا ہے کہ اگر دشمن تمہارے ساتھ نازیبا سلوک کریں تو تم بھی ایسا ہی ناشائستہ سلوک ان سے کرو۔ مسلمانوں کو تو یہ بھی اجازت نہیں دی گئی کہ مشرکین کی مٹی کی مورتیوں کو بھی گالی دیں۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ ان مو غلاموں

سے انتہائی رافت ورحمت کے سلوک کا حکم دیا گیا ہے یہ بات از خود آپ کے قائم کردہ اصول کے خلاف ہے۔ کفار تو آپ کے قیدیوں سے انتہائی بدسلوکی کا برتاؤ کریں اور آپ انہیں اپنی سوسائٹی کے بہترین افراد میں جگہ دیں۔ پھر اگر آپکا اصول مان لیا جائے تو کیا آپ اس کی بھی اجازت دیں گے کہ دشمن اگر مسلمان قیدی عورتوں سے کوئی گستاخی کریں، تو اس کے بدلے میں مسلمان بھی ان کی قیدی عورتوں سے ایسا ہی سلوک کریں ؟ اسلام کے اصول تو بالکل "اپنے ہیں" اور یہ انھیں کے ماتحت حکم دیگا۔ دنیا خواہ کچھ کرے۔

دوسری دلیل پھر اصحاب رسول اللہ اور اہل بیت کے طرز عمل کی پیش کی ہے۔ میرے لیے تو یہ کافی ہو سکتی ہے لیکن معترض اگر کہیں کہ آپ تو وعدہ کر چکے ہیں کہ قرآن سے باہر نہیں جاؤں گا پھر اسی سے ثبوت کیوں نہیں دیا جاتا، تو کیا حق بجانب نہیں ہوگا؟

آپ نے فرمایا ہے کہ احساناً قیدیوں کو چھوڑ دینے میں مسلمانوں کو بہت نقصان رہتا ہے کہ اس صورت میں کوئی قوم اتنی احمق نہ تھی کہ زر فدیہ ادا کرتی لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ بطور احسان چھوڑ دینے میں جو فائدے حاصل ہوئے زر فدیہ کے درہم و دینار انکا کم ہی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس سے اسلام کے متعلق لوگوں کی ذہنیت بدل گئی۔ آنحضرت نے ہزارہا قیدی بلا فدیہ لیے رہا کر دیے اور ان احسانات کا جو اثر ہوا اس کے شاہد زمین و آسمان ہیں۔ پھر سوال تو غلام بنانے اور انھیں فروخت کرنے کا ہے اس کے متعلق فرمائیے کہ قرآن کا کیا حکم ہے ؟ اور آج اگر کوئی قوم فدیہ نہ ادا کرے، اور مسلمان ان کے اسیران جنگ کو احساناً نہ چھوڑنا چاہیں تو ان سے کیا سلوک کریں ؟ ما ملکت ایمانکم اور اسیران جنگ کی بحث آج بڑے اہم مسائل میں سے ہے۔ اسے ضرور حل کیجیے۔

(باقی)

الجواب

توبہ کا مسئلہ توبہ کے مسئلہ میں میرے اور صاحب تعلیمات قرآن کے درمیان لفظی سی نزاع نہیں ہے، جیسا کہ آپ نے خیال فرمایا ہے بلکہ یہ ایک اصولی نزاع ہے۔ صاحب تعلیمات نے لکھا تھا۔

"آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا اور نہ ان کو جنت سے نہ نکالتا۔ صرف ان کی توبہ قبول کی"۔

اس پر مجھے دو حیثیتوں سے سخت اعتراض ہے:۔

اولاً، اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے توبہ قبول ہونے کے بعد بھی گناہ باقی رہتا ہے اور اس کی سزا ملتی ہے۔ یہ بات قرآن کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔

ثانیاً، قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ہم نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ برعکس اس کے وہاں تو یہ ارشاد ہوا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کی توبہ قبول کی اور انھیں ہدایت بخشی۔ یہ محض صاحب تعلیمات کا اپنا قیاس ہے کہ اللہ نے چونکہ حضرت آدم کو جنت سے نکال دیا۔ اور توبہ کے بعد انہیں واپس نہیں کیا، لہٰذا (اور یہ وہی "لہٰذا" ہے جس کی خود آپ نے اپنے مضمون ایمان بالرسالت میں مذمت فرمائی ہے) اللہ نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا۔ قرآن مجید میں اس قسم کی قیاس آرائی کو میں اصولاً ناجائز سمجھتا ہوں، اور یہی وہ تفسیر بالرائے ہے جس کو ہمیشہ سے علمار حق ناجائز کہتے آئے ہیں۔

امر اول کے متعلق جو تصریحات قرآنی اس سے پہلے میں اپنے ایک مضمون میں نقل کر چکا ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ ان سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی، لہٰذا اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کروں گا۔

معنی توبہ توبہ کے لغوی معنی وہی ہیں جو آپ نے بیان کیے ہیں، یعنی عود اور رجوع۔ اگر یہ بندے

کی طرف سے خدا کی جانب ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اپنی نافرمانی پر نادم ہوا، اور از سر نو فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا۔ اور اگر یہ خدا کی جانب سے بندے کے حال پر ہو، تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت حق نے اس کی ندامت اور اس کے رجوع الی الطاعت کو قبول فرمالیا اور اپنی مہربانی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب سوال یہ ہے کہ بندے کی ندامت و رجوع الی الطاعت اور اللہ تعالیٰ کے اس کی جانب مہربانی کے ساتھ متوجہ ہونے کا نتیجہ کیا ہے؟ آیا یہ کہ اس کا گناہ بخش دیا جائے اور جس سزا کا وہ مستحق ہو چکا تھا، اس سے معاف کر دیا جائے؟ یا یہ کہ صرف توبہ قبول کر لی جائے مگر گناہ پھر بھی باقی رہے اور اس کی سزا پھر بھی دیجائے؟ صاحب تعلیمات دوسری صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ (کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرحمۃ ۶: ۲) پہلی صورت کو ترجیح دیتا ہے، اور بار بار یقین دلاتا ہے کہ جب تم گناہ کر کے اس پر شرمسار ہو گے اور نافرمانی کے بعد پھر اطاعت میں داخل ہو گے تو ہم تمہارے جرم کو مہربانی سے ڈھانک دیں گے (مغفرت) اور اس جرم کے اثر کو مٹا دیں گے۔ (عفو)۔

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵: ۶)۔	پس جس نے ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور نیک رویہ اختیار کیا تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶: ۶)	جس کسی نے تم میں سے کوئی برا فعل جہالت کی بنا پر کیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور نیک رویہ اختیار کر لیا تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔
وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا	اور جن لوگوں نے برے اعمال کیے پھر ان کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لائے تو ان کے بعد تیرا رب یقیناً بخشنے والا

لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۷ : ۱۹)	مہربان ہے۔
وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (۲۰ : ۴)	اور یقیناً میں اس کیلئے بڑا بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک عمل کیا پھر راہ راست اختیار کی۔
وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (۴۲ : ۳)	اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔
غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (۴۰ : ۱)	وہ گناہوں کو بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ بندے کی توبہ کا یقینی نتیجہ حق تعالیٰ کی طرف سے قبول توبہ ہے اور قبول توبہ کا یقینی نتیجہ عفو و مغفرت ہے۔ اور کیسے نہ ہو؟ جو خدا اپنے بندوں میں یہ صفت دیکھنا چاہتا ہے کہ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ (۴۲ : ۴) اور وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۳ : ۱۴) کیا وہ خود اپنے لیے اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ ایک بندہ اپنی فطری کمزوری کی بنا پر گناہ کرنے کے بعد شرمسار ہو اور اس کے آگے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی کا طلبگار ہو، مگر وہ اسے معاف نہ کرے اور سزا دے کر ہی چھوڑے؟ اگر خدا میں یہ صفت ہو تو اس کے سوا پھر کون ہے جس سے انسان مغفرت کی امید کر سکے؟ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (۳ : ۱۴)۔

آدمؑ کا گناہ | جب یہ قاعدۂ کلیہ قرآن مجید سے معلوم ہو گیا تو آدم علیہ السلام کے متعلق جو یہ فرمایا گیا ہے کہ فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۲ : ۴)۔ اور ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی (۲۰ : ۷) اس کے معنی یہی لینے چاہییں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان کے گناہ کو معاف کر دیا۔ محض اس واقعہ پر کہ آدم علیہ السلام جہاں سے نکالے گئے تھے وہاں واپس نہیں کیے گئے، کوئی قیاس قائم کرنا اور قرآن کے بتلائے ہوئے

قاعدے کے خلاف اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اللہ نے قبول توبہ کے باوجود حضرت آدم کے گناہ کو معاف نہیں کیا، ایک ناجائز قیاس آرائی ہے۔ حضرت آدم نے صرف ایک حکم کی خلاف ورزی کی تھی، کوئی شرک نہیں کیا تھا کہ وہ معاف نہ ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَاءُ (۴ : ۱۸) اور بالفرض اگر وہ شرک بھی کرتے، تو اس سے توبہ کر لینے کے بعد وہ اسی طرح معاف کر دیے جاتے جس طرح عرب کے مشرکین اسلام لانے کے بعد معاف کر دیے گئے۔ لہذا ایک مسلمان پر واجب ہے کہ حضرت آدم کے جنت میں واپس نہ جانے کی کوئی اور وجہ تلاش کرے، اور اگر کوئی وجہ اس کو نہ ملے، یا کسی وجہ پر اس کا اطمینان نہ ہو، تو سکوت اختیار کرے۔ اپنی عقل سے ایسے نتیجے نکالنا جو قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہوں، کسی مومن قانت کا کام نہیں ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کا غلط طریقہ | یہ بات ایک حد تک قابل مسرت ہے کہ آپ نے صاحب تعلیمات کا قدم بقدم اتباع نہیں کیا، اور قرآن مجید کے بیانات پر اپنے قیاسی "لہذا" کی عمارت نہیں اٹھائی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات قابل افسوس بھی ہے کہ آپ نے قرآن مجید سے استدلال کر کے اس سے وہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے جو خود قرآن ہی کے مقرر کیے ہوئے ایک قاعدۂ کلیہ کے خلاف ہے۔ آپ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

> "آدم علیہ السلام نے گناہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا اس صورت میں دی کہ جنت سے نکال باہر کیا۔ آدم علیہ السلام نے اس پر توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی، مگر گناہ کی وہ سزا بحال رکھی جو ان کو دی گئی تھی اور گناہ کے اثرات کو زائل نہ کیا، البتہ ان کے لیے قبول توبہ کی یہ شکل اختیار کی کہ انہیں جنت میں واپس آنے کا راستہ بتا دیا۔"

یہ نتیجہ جو آپ نکال رہے ہیں قرآن مجید کی اس تصریح کے خلاف ہے کہ وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (۴۲ : ۲)۔ اس آیت میں تصریح ہے کہ قبول توبہ کے بعد گناہوں کے اثرات مٹا دیے جاتے ہیں۔ مگر آپ اس کے برعکس فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی

سے یہ معنی نکال رہے ہیں کہ توبہ قبول کرنے کے بعد گناہ کا اثر باقی رہا اور صرف اس شکل میں توبہ قبول کیگئی کہ وہ راستہ بتا دیا گیا جس سے گناہ کے اثرات زائل ہوجائیں۔ یہ بات تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کے خلاف ہے۔ قرآن سے قرآن کی تفسیر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک آیت کی ایسی تفسیر کی جائے جو قرآن مجید کی دوسری آیت یا آیات سے مطابقت رکھتی ہو۔

گناہ سزا اور توبہ کی حقیقت | میں نے سزا اور گناہ کے "فلسفہ" پر جو روشنی ڈالی تھی وہ اسی غرض سے تھی وہ میرا اپنا اختراعی فلسفہ نہ تھا، بلکہ قرآن مجید کے ارشادات سے ماخوذ تھا، اگر آپ اس پر غور فرماتے اور اس کو سمجھ لیتے تو حضرت آدم کی توبہ کے مقبول ہونے اور ان کا گناہ معاف ہوجانے، اور اس کے باوجود ان کے جنت سے نکالے جانے کی وجہ آپ کی سمجھ میں آجاتی۔ آئیے، اب قرآن مجید سے اس "فلسفے" کی تھوڑی سی تشریح سن لیجیے۔

سب سے پہلے یہ قاعدہ ذہن نشین ہوجانا چاہیے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک نظام جسمانی۔ دوسرے عقل جو غور و فکر کرتی اور بھلے برے میں تمیز کرتی ہے پہلی چیز پر اللہ تعالیٰ کے قوانین طبیعی (Physical Laws) حکمران ہیں، اور دوسری چیز پر اس کے عقلی احکام و اوامر (Rational Laws) کی حکومت ہے طبیعی قوانین ایک خاص ڈھنگ پر بنائے گئے ہیں اور سارے عالم مادی کی طرح انسان کا جسم بھی ان کے ماتحت ہے اس عالم میں انسان جو حرکت بھی کرے گا، اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو قوانین طبیعی کے تحت مقرر ہے، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحت سے کسی خاص موقع پر اس کو بدل دے بخلاف اس کے عالم عقلی میں حرکات کے نتائج اس طور پر مقرر نہیں ہیں جس طور پر عالم طبیعت میں مقرر ہیں۔ یہاں ان کے درمیان اس لحاظ سے تمیز کیجاتی ہے کہ وہ امر الٰہی کے اتباع میں ہیں یا اس کے خلاف! اتباع میں ہیں تو وہ اعمال صالحہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر خوش ہوتا ہے، اور انعام دیتا ہے، خواہ قوانین طبیعی کے ماتحت ان کے نتائج

بالکل مختلف صورت میں ظاہر ہوں۔ اور اگر وہ امر آلہی کے خلاف ہیں تو وہ گناہ ہیں، اعمال قبیحہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر غضبناک ہوتا ہے، اور سزا دیتا ہے خواہ قوانین طبیعی کی رو سے ان کے نتائج اس دنیا میں خوش گوار ہوں۔ اگر انسان کسی گناہ کے بعد توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے، اس کا غضب فرو ہو جاتا ہے اور اس فعل کا وہ عقلی نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا جو قوانین عقلی کی رو سے ایسے افعال کے لیے مقرر کیا گیا ہے لیکن توبہ سے اس فعل کے طبیعی نتائج کا بدل جانا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ جس طرح گناہ ایک امر عقلی ہے اسی طرح توبہ بھی ایک امر عقلی ہے قوانین طبیعی کے اعتبار سے گناہ کی حیثیت محض ایک حرکت کی ہے، اور حرکت سے اسباب طبیعی میں جو تحریک ہوتی ہے، وہ بہر حال اپنے طبیعی نتائج کی طرف منجر ہوتی ہے۔ توبہ سے اس تحریک میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوتا، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص موقع پر خاص مصلحت سے اس کے لیے قوانین طبیعی میں کوئی جزئی ترمیم کر دے چونکہ اللہ تعالیٰ عالم عقلی کی طرح عالم طبیعی کا بھی حاکم مطلق ہے، اس لیے بسا اوقات وہ عالم طبیعت میں بھی امور عقلیہ کے مطابق تصرف کرتا ہے، مثلاً کسی قوم کے گناہوں پر اسے دنیا میں عذاب دینا، اور کسی نیک بندے کو ان نتائج سے بچا دینا جو اس کے فعل پر قوانین طبیعی کے تحت رونما ہونے چاہیے تھے اور کسی گناہ گار بندے کی توبہ کے بعد ان اثرات کو بھی زائل کر دینا جو قوانین طبیعی کی رو سے ظاہر ہونے والے تھے لیکن یہ سب کچھ حق تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ چاہے تو امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبیعی میں ترمیم کر دے جس طرح حضرت ابراہیم یا قوم یونس کے لیے کی تھی، اور نہ چاہے تو نہ کرے، جیسا کہ ہم رات دن اہل خیر کو دنیوی مصائب میں مبتلا ہوتے اور اہل شر کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا ہے، قرآن مجید کی بکثرت آیات اس پر شہادت دیتی ہیں۔ قرآن کی رو سے انسان اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے احکام و اوامر کا مخاطب اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ایک جسم نامی متحرک بالارادہ ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ صاحب عقل و فکر اور قوت علمیہ سے بہرہ ور [illegible] قلن

فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۶ : ۱۲) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۰ : ۲۴) وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۴) وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲ : ۳۷) وَكَذٰلِكَ يُبَيِّنُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲ : ۲۶)

اس عقل و فکر کو خطاب کر کے جتنے امر و نہی کے احکام دیے گئے ہیں وہ سب امور عقلیہ ہیں، ان کے اتباع یا ان کی خلاف ورزی میں جتنے افعال انسان کرتا ہے، وہ بھی اس اعتبار سے عقلی افعال ہیں، اور ان پر ثواب و عقاب جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ایک امر عقلی ہے۔ دیکھیے جو لوگ اللہ سے کفر کرتے ہیں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان پر وہ غضبناک ہوتا ہے:۔

مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (۱۶ : ۱۰۶) عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ (۴۸ : ۶) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۵۸ : ۱۴) حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ (۴۲ : ۱۶) اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲۰ : ۸۶) یہ کفر اور نافرمانی بھی عقلی ہے اور اس پر غضب بھی عقلی ہے۔

پھر جب اللہ کسی پر غضب ناک ہوتا ہے تو اس سے انتقام[1] لیتا ہے اور اسے سزا دیتا ہے:۔

وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (۵ : ۱۳) فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا (۳۰ : ۵) اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲ : ۲۲) قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

[1] لفظ انتقام کو لوگ نفسانی انتقام کے معنوں میں لیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ لفظ سن کر کان کھڑے کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ انتقام عقلی ہے عقل و حکمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ حکم کی خلاف ورزی پر حاکم ناخوش ہو اور اس کی سزا دے اور انجام کار میں نافرمان اور فرمانبردار برابر نہ رہیں۔ اسی چیز کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ؟ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (۳۸ : ۲۸)۔

(۴۳ : ۲) فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ (۴۳ : ۴) یہ انتقام کبھی تو صرف آخرت میں بشکل عذاب جہنم ہی ہوگا يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ (۴۴ : ۲) اور کبھی کبھی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اسباب طبیعی سے کام لے کر ان قوموں پر بلائیں نازل کرتا ہے جن سے وہ انتقام لینا چاہتا ہے، فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا (۷ : ۱۶) إِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۱۵ : ۵) فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ فَمِنْهُمْ مَنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُمْ مَنْ أَغْرَقْنَا (۲۹ : ۴)

ان آیات میں جن دنیوی عذابوں کا ذکر ہے وہ ان قوموں کی حرکات کے طبیعی نتائج نہ تھے، کیونکہ رسولوں کی تکذیب اور آیات الٰہی سے کفر وہ چیز نہیں جس پر قوانین طبیعی کے تحت آندھی اور سیلاب آئیں یا پتھراؤ ہو یا زمین دھنس جائے۔ اگر کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو ان امور عقلیہ پر اسباب طبیعی بھی حرکت میں آجاتے ہیں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ رات دن ہم دیکھتے ہیں کہ رسولوں کی تکذیب کی جاتی ہے اور آیات الٰہی سے کفر ہوتا ہے مگر ہر ایسے موقع پر سیلاب نہیں آتے۔ نہ پتھراؤ ہوتا ہے، نہ زمین دھنستی ہے، اس لیے کہ یہ افعال دراصل عقلی افعال ہیں، اور ان کا اصلی نتیجہ عقلی نتیجہ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ اس دنیا میں ان کے برے نتائج کا ظہور ضروری نہیں ہے۔

اسی طرح توبہ (جو ایک امر عقلی ہے) کا بھی عقلی نتیجہ صرف یہ ہے کہ اللہ کا غضب جو گناہ پر بھڑک اٹھا تھا، فرو ہو جائے، اور انسان اس کی عقلی سزا (یا قرآن کی اصطلاح میں انتقام) سے معاف کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ اس فعل کے جو طبیعی نتائج قوانین طبیعی کے تحت مترتب ہونے والے تھے وہ بھی توبہ کے ساتھ ہی روک دیے جائیں، تو یہ ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہتا ہے تو کسی خاص مصلحت کی بنا پر ان کو روک بھی دیتا ہے، جیسا کہ قوم یونس کے حق میں اس نے کیا۔ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ (۱۰ : ۱۰) لیکن عموماً وہ عالم مادہ و اجسام میں امور عقلی

کی خاطر عادت مقررہ کو نہیں بدلتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ شراب کی عادت رکھنے کے بعد توبہ کر لیتے ہیں ان کے اعضاء رئیسہ کی خرابیاں توبہ کے ساتھ دور نہیں ہوتیں۔ البتہ وہ توبہ کی بدولت اس کی عقلی سزا سے حسب وعدۂ الٰہی مصئون ہو جاتے ہیں۔

اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ آدم علیہ السلام نے جو فعل کیا تھا اس کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک نفس فعل ہونے کی حیثیت، یعنی شجر ممنوع کو چکھنا جس کا ایک طبعی نتیجہ مقرر تھا۔ دوسری اس کی حیثیت کہ وہ امر الٰہی کے خلاف تھا، ظلم اور گناہ تھا جس کا عقلی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور انتقام کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ حضرت آدم یہ فعل کرنے کے بعد اس کے طبعی اور عقلی دونوں نتائج کے مستحق ہو چکے تھے۔ مگر جب انھوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس امر عقلی کی بنا پر اس فعل کے عقلی اثر کو زائل کر دیا، یعنی ان کی توبہ قبول کر کے ان کے گناہ کو معاف کر دیا، انھیں برگزیدگی کا شرف عطا کیا اور ان کو راہ راست کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ رہا ان کے فعل کا طبعی نتیجہ، تو وہ ظاہر ہوا۔ وہ اپنی بشری کمزوریوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد قیام جنت کے لائق نہ رہے تھے اس لیے انھیں زمین پر اتار دیا گیا، اور جنت میں واپس آنے کے لیے شرط لگا دی کہ اپنے نفس پر غلبہ پا کر قیام جنت کا استحقاق ثابت کرو۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۲۰:۷۹)

آپ کہتے ہیں کہ توبہ کا یہ اثر بھی کیوں نہ ہوا کہ ان کے فعل کا طبعی اثر بھی زائل کر دیا جاتا۔ لیکن یہ اللہ سے خرق عادت کا مطالبہ ہے جس کو پورا کرنے پر وہ مجبور نہیں۔ وہ یقیناً خرق عادت پر قادر ہے اور جب اس کی مصلحت کا اقتضاء ہوتا ہے تو وہ اپنی اس قدرت کو ظاہر بھی کرتا ہے لیکن امور عقلیہ کی خاطر قوانین طبعی میں ترمیم کرتا ہمیشہ ضروری نہیں ہے، اور نہ مصلحت خاص کے بغیر وہ کبھی ایسا کرتا ہے بلکہ حضرت آدم کے معاملہ میں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مصلحت اسی کی مقتضی تھی کہ ان کے فعل کا طبعی

نتیجہ ہبوط کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ کیونکہ وہ جنت میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ زمین کی خلافت کے لیے پیدا کیے گئے تھے اور کبھی نہ کبھی ان کا زمین پر اترنا ضروری تھا۔

غلامی کا مسئلہ | مولانا اسلم جیراجپوری نے اسیران جنگ کو غلام بنانے کے خلاف اس آیت سے استدلال کیا ہے

حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ　　یہاں تک کہ جب ان کا زور توڑ لو تو ان کو قید کر لو۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً (۴۷:۱)۔　　پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔[۱]

اس آیت سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسیران جنگ کے حق میں دو ہی صورتیں قرآن نے تجویز کی ہیں۔ یا تو بلا کسی معاوضے کے انہیں رہا کیا جائے یا معاوضہ لے کر لیکن رہا کرنے کا حکم قطعی ہے، اور غلام بنا کر رکھنا کسی حال میں جائز نہیں۔

اب ہم کو تین حیثیتوں سے اس آیت پر نظر ڈالنی چاہیے:

اولاً یہ کہ آیت کے الفاظ سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

ثانیاً یہ کہ قرآن مجید کی دوسری آیات کی روشنی میں اس کی صحیح تفسیر کیا ہے۔

ثالثاً یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا مفہوم سمجھا اور کس طرح عمل کیا؟

آیت کا مفہوم | آیت میں مَنًّا اور فِدَاءً دونوں کے ساتھ لفظ اِمَّا آیا ہے، جو یا تو تخییر کے معنی میں ہے یا اباحت کے معنی میں یعنی اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ تمہیں اختیار ہے چاہے احسان کرو چاہے فدیہ لے لو، یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے لیے احسان کرنا بھی جائز ہے اور فدیہ لینا بھی۔ اس سے کسی طرح بھی حصر کا مفہوم نہیں نکلتا کہ تم ان دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ حکم قطعی تو صرف اس حد تک تھا کہ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ۔ یعنی جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب مار چکو اور ان میں مقابلے کی طاقت باقی نہ رہے تو بقیۃ السیف لوگوں کو باندھ لو۔ اس حکم کے بعد مسلمانوں کو اختیار دیا جاتا ہے یا ان کو اجا

۱؎ ترجمہ خود مولانا اسلم جیراجپوری کا ہے

کیا جاتا ہے کہ چاہیں قیدیوں کے ساتھ احسان کریں چاہیں فدیہ لے لیں۔

اس کے بعد لفظ مَنّ قابل غور ہے۔ مَنّ کے معنی صرف احسان کے ہیں "احسان رکھ کر چھوڑ دو" مترجم کا اپنا اضافہ ہے۔ اگرچہ احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے لیکن ایک صورت یہ بھی تو ہے کہ قید کی حالت میں اُن کے ساتھ احسان کا برتاؤ کیا جائے۔ اس صورت کی نفی "اور صرف رہائی میں مفہوم احسان کا انحصار" کہاں سے نکلتا ہے۔ اگر قرآن میں کوئی لفظ یا اشارہ ایسا ہے جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ احسان سے مراد صرف رہا کر دینا ہے، تو براہ کرم اس کو بیان کیا جائے۔

قرآن مجید کی دوسری آیات | اب تلاش کیجیے کہ قرآن میں کونسی آیت ایسی ہے جس میں یہ حکم ہو کہ قیدیوں کو مجاناً رہا کرنے یا فدیہ لے کر چھوڑنے کے سوا کوئی تیسری صورت جائز نہیں ہے اور ان کو غلام بنا کر رکھنا حرام ہے۔ یقیناً ایسی کوئی آیت آپ پیش نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق بکثرت احکام آپ کو قرآن میں ملتے ہیں جو مذکورۂ بالا آیت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کے احکام کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک رہائی کا حکم قطعی نہیں آیا تھا اس لیے لونڈی غلاموں کا رکھنا جائز تھا اور ان کے متعلق احکام بھی آئے تھے لیکن بعد کی آیات کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اس آیت کا جو مفہوم آپ لے رہے ہیں اس کی رو سے تو یہ آیت نازل ہوتے ہی تمام لونڈی غلام رہا ہو جانے چاہییں تھے۔ مگر بعد کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رہا نہیں ہوئے، اور ان کے متعلق اسی طرح احکام آتے رہے جس طرح پہلے آتے تھے۔

آیت مذکورہ سورۂ محمدؐ کی ہے جس کا کچھ حصہ مکہ میں اترا ہے، اور کچھ حصہ مدینۂ طیبہ کے ابتدائی زمانہ میں۔ ابن عباسؓ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا مطلب یہ ہے کہ جب جنگ بدر کے روز کفار سے تمہارا مقابلہ ہو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کی تائید قرآن مجید کی یہ آیت کرتی ہے۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ اِلٰى اٰخِرِ الْاٰيَة (۸:۹)
یہ آیت جنگ بدر کے قیدیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے اور اس میں جو عتاب نازل ہوا ہے وہ صاف اشارہ کرتا ہے

کہ سورۂ محمد والی آیت میں شدّ وثاق سے پہلے اثخان فی الارض کا جو حکم دیا گیا تھا، اس پر پورا پورا عملدرآمد نہ کرنے کی وجہ سے عتاب فرمایا گیا پس متحقق ہو گیا کہ سورۂ محمدؐ کی یہ آیت ۴ سنہ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

اب ملاحظہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان لونڈیوں کو جائز کیا جاتا ہے جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ (۳۳ : ۶)	اے نبی ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہیں تمہاری وہ بیبیاں جن کے تم نے مہر ادا کیے ہیں اور وہ لونڈیاں جو خدا نے تم کو جنگ میں بطور غنیمت دلوائی ہیں۔

اس آیت میں مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ سے مراد لونڈیاں ہیں، اور لونڈیوں کی تعریف مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ (جو اللہ تعالیٰ نے تم کو لڑائی میں بطور غنیمت دلوائی ہوں) سے کی ہے سب جانتے ہیں کہ بدر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فَے عطا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا بدر کے بعد لڑائیوں میں جو عورتیں مسلمانوں کے پاس قید ہو کر آئیں انہی کو لونڈیاں بنا کر رکھنا قرآن مجید نے جائز قرار دیا تھا پھر ارشاد ہوتا ہے

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (۳۳ : ۶)	اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ کہ ان کو بدل کر دوسری بیبیاں کر لو، اگرچہ تمکو ان کا حسن پسند آئے مگر لونڈیاں حلال ہیں۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ تک پہنچ چکی تھی حضورؐ کا آخری نکاح ۷ سنہ کے خاتمہ پر ہوا ہے لہٰذا اس آیت کے نزول کا زمانہ ۷ سنہ سمجھنا چاہیے یہاں پھر مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ کی تحلیل موجود ہے ۷ سنہ کے اواخر میں غزوۂ اوطاس ہوا بہت سی عورتیں پکڑی ہوئی آئیں ان میں جو بیاہی ہوئی عورتیں تھیں ان کے معاملے میں مسلمان متردد ہوئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴ : ۴)	تمہارے لیے بیاہی ہوئی عورتیں حرام ہیں مگر وہ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر تمہارے ہاتھ آئیں

سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی	اور اگر تم کو خوف ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکوگے
فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی	تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کر لو دو دو تین
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا	تین چار چار۔ اور اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکوگے تو ایک
فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ( )	ہی نکاح کر و یا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں ہو۔

یہ حکم سنہ اور سنہ ہجری کے درمیان کا ہے۔ ان مختلف احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے قرآن مجید کا مقصد وہ نہ تھا جو مولانا اسلم جیراجپوری نے سمجھا ہے۔ ورنہ اس آیت کے نزول کے بعد لونڈیوں کا رکھنا سرے سے ممنوع ہو جاتا نہ کہ اس کی اجازت دی جاتی اور ان کے متعلق احکام دیے جاتے۔

ایک نکتہ | اس سلسلہ میں مولانا اسلم جیراجپوری نے ایک لطیف نکتہ بھی بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن میں جہاں جہاں مملوکوں کا ذکر ہے بصیغۂ ماضی یعنی ما ملکت ایمانکم ہے بصیغۂ مستقبل کہیں نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن غلاموں کے وہ مالک ہو چکے تھے صرف انہی کی ملکیت قائم رکھی گئی تھی" اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں جو احکام بصیغۂ ماضی ارشاد ہوئے ہیں وہ مستقبل کے لیے نہیں ہیں۔ مثلاً گیلڑ لڑکیاں اپنے سوتیلے باپوں کے لیے جس آیت میں حرام کی گئی ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ (۴ : ۴) یہاں دَخَلْتُمْ صیغۂ ماضی ہے لہٰذا صرف ان عورتوں کی بیٹیاں حرام ہوئیں جو نزول آیت سے پہلے مسلمانوں کے نکاح میں آچکی تھیں۔ آیندہ کے لیے یہ حکم نہیں ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (۸ : ۵) میں بھی خمس کا حکم صرف ماضی کے لیے ہے۔ بعد کے غنائم میں خمس نہیں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ (۶۲ : ۲) میں جمعہ کی نماز کا حکم بھی ان لوگوں کے لیے تھا جو اس وقت ایمان لا چکے تھے۔ بعد کے مسلمان اس حکم سے بچ گئے۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ (۴۲ : ۳)

میں صرف ان اختلافات کا فیصلہ احکام الٰہی کی رو سے کرنے کا حکم ہے جو پہلے واقع ہو چکے تھے۔ بعد کے اختلافات میں حکم الٰہی کی طرف رجوع کرنا ضروری نہ ہوگا۔ غرض جناب مولانا نے یہ ایسا نکتہ نکالا ہے جو آج تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ ورنہ اب تک مسلمان ان بہت سے احکام کی بندشوں سے آزاد ہو چکے ہوتے جو صیغۂ ماضی دیے گئے تھے، اور جن میں اللہ میاں نے (نعوذ باللہ شاید بے احتیاطی کی بنا پر) مستقبل کا صیغہ استعمال نہ کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح تو کافروں اور آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے لیے بھی آتش دوزخ سے رہائی مل جاتی کیونکہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (۱:۶۴) میں کفروا اور کذبوا دونوں ماضی کے صیغے ہیں۔ لہٰذا بعد کے تمام کفار و مکذبین اس وعید سے بچ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ آفرینی معنوی تحریف کی حد تک پہنچتی ہے۔ قرآن مجید کے معانی میں ایسی تحریف کرتے ہوئے ایک مسلمان کا ایمان لرز جانا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً اور مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا کیا مفہوم سمجھا، اور اس پر کس طرح عمل کیا۔

بنی قریظہ کے حق میں حضرت سعد بن معاذ نے فیصلہ کیا کہ ان کے بالغ مرد قتل کیے جائیں اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ کو نافذ فرمایا

خیبر کی جنگ میں بہت سی عورتیں گرفتار ہوئیں اور وہ مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ انہی عورتوں میں سے تھیں۔

غزوۂ حنین میں ۶ ہزار عورتیں اور بچے قید ہونے کے بعد میں ہوازن کا وفد حاضر ہوا اور اس نے سبایا کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جو میرے اور بنی عبدالمطلب کے قبضہ میں ہیں ان کو میں احسان کے طور پر رہا کرتا ہوں۔ مگر دوسروں کے معاملہ میں حکم دینے کا مجھے حق نہیں۔ صرف سفارش کر سکتا ہوں۔ چنانچہ حضور کی سفارش پر انصار اور مہاجرین نے اپنے اپنے حصے کے سبایا کو چھوڑ دیا۔ مگر

بنو تمیم اور بنو فزارہ اور بنو سلیم کے نمایندوں نے انکار کیا۔ آخر کار حضور نے ان سے وعدہ کیا کہ بعد کی لڑائیوں میں جو سبایا ہاتھ آئیں گے ان میں سے ہم تمکو ایک ایک کے بدلے چھ چھ دیں گے۔ تب وہ ہوازن کے قیدیوں کو چھوڑنے پر راضی ہوے۔

اوطاس کے سبایا کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جن کے حق میں خود قرآن مجید کی آیت وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ نازل ہوی۔

اس میں شک نہیں کہ حضور نے بعض مواقع پر قیدیوں کو احسان کے ساتھ رہا بھی کیا ہے کبھی قیدیوں کا مبادلہ بھی کیا ہے، اور کبھی زر فدیہ لے کر بھی چھوڑ دیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے عہد میں بکثرت قیدی لونڈی غلام بنا کر بھی رکھے گئے ہیں۔ اور ان کو مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کیا قرآن مجید کے احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سمجھنے والا اور ان کے مطابق عمل کرنے والا کوئی اور ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ایسا سمجھتا ہے تو سمجھتے رہیے اس کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ نہیں ہے، اور وہ اسی قانون کو برحق سمجھتے ہیں جو اللہ کے رسول نے اپنے قول و عمل سے بنا دیا ہے۔ (باقی)

فضل فونٹین پن

سینیر ۶ ۸ جونیر ۱۱۰

نیا اسٹاک آچکا ہے

خوبصورت پائدار قیمت واجبی علاوہ اس کے سامان اسٹیشنری کاغذ وغیرہ خط و کتابت سے طلب فرمائیے۔

فدا علی محمد علی تاجر کاغذ پتھر گٹی حیدرآباد دکن